© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

احیائے اسلام اور اس کے تقاضے

(۲)

اس میں کچھ شک نہیں کہ آلاتِ محنت کی تبدیلی سے معاشرہ کے ان رشتوں پر قطعی اثر پڑتا ہے جن کا تعلق براہِ راست مزدوروں کسانوں اور ان کے آقاؤں سے ہے لیکن یہاں دو سوال ابھرتے ہیں :

۱۔ آلات کی ایجاد کا سہرا کیا خود انسانی فکر و تعمق یا اتفاق کی طرفہ طرازیوں کے سر نہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ تاریخ کی مادی ضرورتیں انسان کو ایجاد و اختراع پر مجبور کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑی بڑی اختراعات اکثر اتفاقاً معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

۲۔ کیا یہ ضروری ہے کہ یکساں نوعیت کے آلاتِ محنت یا کیفیتِ انتاج، یکساں نوعیت کے افکار و تصورات کی تخلیق کا باعث ہوں۔ یونان میں ایک ہی فضا کے تحت سقراط، افلاطون، ارسطاطالیس اور ہیراکلیٹس جیسے عظیم فلسفی پیدا ہوئے ہیں جن کے نظامہائے فکر ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ روم اور یونان نے ایک ہی دور میں تہذیب و تمدن کی بوقلمونیوں کو جنم دیا ہے۔ اور آج اس انقلاب آفرین صنعتی دور میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کا نظام جو ایک دوسرے کی عین ضد ہیں، نہ صرف پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں اور پھل پھول رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے اثرات کو قبول بھی کر رہے ہیں۔ سرمایہ داری میں منصوبہ بندی آرہی ہے، ایسے وسائل و ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں جن سے غربت، جہالت، اور بیماری پر قابو پایا جا سکے اور اجتماعی انصاف کے تقاضوں کو ممکن حد تک پورا کیا جا سکے۔ اسی طرح اشتراکیت نے بھی اپنا مزاج بدلا ہے۔ اب اس میں وہ پہلی سی یبوست یا علیحدگی پسندی کا رجحان نہیں رہا۔ اور سیاسی لحاظ سے تو اس کی تنظیمات میں جمہوری تصورات کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ کیفیتِ انتاج ہی سب کچھ نہیں اور تاریخ کے مادی تقاضے ہی فیصلہ کن نہیں۔ انسانی ذہن انسانی ارادہ، تجربہ اور تاریخ جس کو انسان شعور و تجربہ کی روشنی میں ترتیب دیتا ہے ایسے عوامل ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو مل جل کر معاشرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دینی نقطۂ نظر سے تاریخ کے بارہ میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کی ترتیب و تبویب میں ایک اور زبردست ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ اس نے اس دنیا کو بنا کر یونہی بے مقصد نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کی مشیت کا یہ تقاضا ہے کہ کشاکشِ حیات میں انسان کی رہنمائی کرے اس کی صلاحیتوں کو جِلا دے، اس کی مشکلات کو کم کرے اور اسے اس لائق کرے کہ یہ صحیح معنوں میں اس دنیا میں اس کا نائب ثابت ہو۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم میں غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ وہ ہمدرد و شفیق اور بدرجۂ غایت مہربان ہے اور بتدریج کائناتِ انسانی کو ان عقاید، تصورات اور اقدار کے قریب تر کر رہا ہے۔ جن کو وہ پسند کرتا ہے۔ تاریخِ انسانی کو صرف آلاتِ محنت یا کیفیاتِ انتاج کی روشنی میں سمجھنا مشکل ہے۔ یہی نہیں، انسانی عزم و ارادہ سے بھی اس کی مکمل تشریح نہیں ہو پاتی۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیوضِ رحمت پر بھی غور کیا جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ جس ذاتِ گرامی نے انسان کو پیدا کیا ہے جس ذاتِ گرامی نے یہ بزمِ حیات سجائی ہے۔ اور جس ذاتِ اقدس نے انسان کو خرد و عقل کے خزائن بخشے ہیں۔ خود اس کا منشا کیا ہے؟ وہ تاریخ کے دھارے کو کس رُخ پر لے جانا چاہتا ہے ـــــ اگر تاریخِ انسانی کو سمجھنے کے اس اصول کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر انبیاء و رسل کے پاکیزہ نظام کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ وہ بلند و بالا ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے دور کے خلاف جہاد کیا ہے۔ جنھوں نے تاریخ کو اس انداز سے ترتیب دینے سے انکار کر دیا جس انداز سے وقت کے بڑے بڑے سرکش اور جابرہ ترتیب دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے مظلوم کی حمایت کی، غریبوں، بے کسوں اور کمزور لوگوں کو سہارا دیا۔ انھیں اطمینان بخشا اور قناعت و صبر کی دولت بے پایاں سے نوازا۔ انھوں نے انسانی شرف کو زندہ کیا، برابری، مساوات اور اخوت کی تلقین کی۔ اور انسانی معاشرہ میں بلندی و عظمت کا معیار بجائے دولت، عزت و جاہ کے صرف اس بات کو قرار دیا کہ کون عند اللہ زیادہ متقی ہے، زیادہ پاکباز ہے اور کس کی نیکیوں سے معاشرہ زیادہ متاثر ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے احسانات کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے اوّل اوّل انسان میں احساسِ ذمہ داری کو ابھارا۔ انھیں شریعت و قانون کے سانچوں میں ڈھالا۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے آشنا کیا اور بتایا کہ مقامِ عبودیت کے لطائف کیا ہیں۔ ان میں اخلاقی بلندیاں پیدا کیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں علم و عرفان کی روح کو بیدار کیا۔ اور غور و فکر اور تعمق و ادراک کی شمعوں کو اس طرح فروزاں کیا کہ ان کی روشنی میں چل کر علوم و فنون کے نئے نئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آفتاب وماہتاب پیدا ہوئے ہم تاریخ کے اس ادھورے اور ناقص تصور کو نہیں مانتے کہ اس کو صرف مادیت کے تصور میں منحصر جان لیں۔ ہمارے نزدیک تاریخ کے چہرۂ زیبا کو سنوارنے اور اس کے رُخ و رخسار کو نکھارنے میں، اس سرچشمہ جمال کا بہت بڑا حصہ ہے جو تکوینی اور تشریعی اسلوب سے انسان کو زیادہ نیک اور زیادہ صالح اور خرد و ہوش کے اعتبار سے زیادہ زیرک دیکھنا چاہتا ہے۔

مشہور عمرانی نظریات پر اس تنقید کے یہ معنی نہیں کہ یہ بالکل غلط ہی ہیں اور ان میں ذرہ بھر سچائی پائی نہیں جاتی۔ اس تنقید سے ہمارا مقصد صرف یہ جتانا ہے کہ یہ چونکہ ناقص تجربے پر مبنی ہیں اور اس وجہ سے ان سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بھی ناقص اور ادھورے ہیں۔ لہٰذا ان نظریات کی بنا پر احیائے اسلام کے خواب کے بارہ میں یہ سوء ظن رکھنا صحیح نہیں کہ یہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ اس دور میں اسلام کی باتیں کرنا غیر علمی اور رجعت پسندانہ حرکت ہے۔ اگر انسانی تاریخ ہے پتھر، نباتات اور حیوانات کی تاریخ نہیں۔ اور اس کی ترتیب میں انسانی شعور و ادراک کی طرفہ طرازیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کی منزل و راہ کی تعیین میں مشیتِ ایزدی غافل اور غیر جانبدار نہیں بلکہ برابر کارفرما اور فعال ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ احیائے اسلام کی تحریک کے لیے آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور موجودہ تہذیب و تمدن میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا کرنے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ کیونکہ یہ خرد و عقل کا مذہب ہے، اللہ کا دین ہے اور انسانی فطرت و ضمیر کا بہترین وکیل اور پاسبان ہے۔

ہمارے نزدیک احیائے اسلام کے سلسلہ میں اصل اشکال یہ نہیں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے بلکہ اصل اشکال خود مسلمانوں کے اندازِ فکر سے پیدا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں اس وقت دو گروہ ہیں جن سے بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی کشتی کو ساحلِ مراد تک لے جانے میں یہ ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک گروہ علمائے کرام کا ہے اور دوسرا گروہ ان انگریزی داں حضرات کا ہے جو مغربی تہذیب سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے باوجود دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کا بول بالا ہو اور اس کی ہمہ گیر سچائیاں نکھر کر ایک مرتبہ پھر دنیا والوں کے سامنے آئیں۔

اوّل الذکر گروہ مخلص ہے اور مادیت کے اس دور میں بھی اسلام کا پرچم بلند کیے ہوتے ہے۔ اس گروہ میں اکثریت ایسے سادہ لوح حضرات پر مشتمل ہے جو یہ سننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ ان کے گردوپیش کی ساری دنیا بدل گئی ہے اور فی الواقع انھیں نئے مسائل کا سامنا ہے۔ اور اس میں ان کا کچھ قصور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی نہیں۔ ان لوگوں نے جس ماحول میں تربیت پائی ہے اور جس تہذیب کے یہ عملاً حامل چلے آرہے ہیں اس کا یہ منطقی تقاضا ہے کہ جدید فکر اور جدید تہذیب کے مخالف اسلام پہلو ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔

دوسرا گروہ اگرچہ اسلامی درد کی دولت بے پایاں سے بہرہ مند ہے لیکن اس کی مصیبت یہ ہے کہ اسلام کی تخلیقی صلاحیتوں سے ناآشنا ہے۔ یہ گروہ اس راز سے ناواقف ہے کہ اسلام ہر ہر دور میں انسانوں کی راہنمائی کا متکفل ہے اور ہر ہر زمانہ میں اس کی روشنی سے تہذیب و تمدن کے چہرۂ زیبا کو اور روشن اور تابناک بنایا جاسکتا ہے۔ اور اس کی سادہ، بنیادی اور اساسی تعلیمات پر ہر ہر عہد میں اخلاق و روحانیت اور زندگی کے نئے نئے اور پرشکوہ عزفے تعمیر کیے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان لوگوں کی تحریروں میں اپج، اجتہاد اور تخلیق و اختراع کے داعیے پائے نہیں جاتے بلکہ اس کے برعکس اس گروہ کی اسلامی خدمات پر "معذرت خواہی" اور تاویلاتِ فاسدہ کی چھاپ نمایاں ہے اور ان کے دلائل اور زورِ بیان کا حاصل صرف یہ ہے کہ اسلام اس دور کے ساتھ کسی نہ کسی طرح چل سکتا ہے اور اس کی تعلیمات کو اس رنگ میں پیش کرنا ممکن ہے کہ اس کے بارہ میں کوئی زبان طعن دراز نہ کرسکے۔

ظاہر ہے اس اندازِ فکر سے احیائے اسلام کا کام انجام نہیں پاسکتا، اس کے لیے ایک طرح کا تعین درکار ہے، ادعا کی ضرورت ہے اور ایسی تخلیقی کوششوں کی حاجت ہے جن میں اسلام کی حیثیت ایک مغلوب عنصر کی نہ ہو، بلکہ ایسے غالب جزو ترکیبی کی ہو جو تہذیب انسانی کو نیا رنگ و روغن عطا کرے، اور نیا نکھار بخشے، یا صحیح تر اندازِ بیان میں کہنا چاہیئے کہ جو موجودہ تہذیبی تصورات میں بالکل نئی روح پھونک دینے میں کامیاب ہوسکے۔

احیائے اسلام کا یہ عظیم منصوبہ کیونکر پروان چڑھ سکتا ہے؟ یہ سوال خاصہ اہم ہے اور ایک مفصل تجزیہ کا مقتضی ہے لیکن اس سلسلہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ آج حالات بدل گئے ہیں فکر و تعمق کی راہیں بدل گئی ہیں۔ اسلوب اور اندازِ بیان پہلے سے مختلف ہے۔ یہی نہیں، علم الکلام سے لے کر اجتماعی مسائل تک ایک ایک چیز اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے شدید اختلاف ہے جو اس بارہ میں کوئی سنجیدہ رائے رکھنے کے بجائے سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور یہ کہہ کر قلب و ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام مکمل ہے اور اس کا تجویز کردہ نقشہ ہماری ہر ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہے، لہٰذا حالات کی کوئی تبدیلی ہمارے لیے پریشانی کا باعث نہیں۔ اس میں کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبہ نہیں کہ اسلام مکمل نظامِ حیات ہے لیکن اس کے یہ معنی کب ہیں کہ معاشرہ ساکن ہے، علوم و فنون کا قافلہ رک گیا ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے نئے مسائل کو جنم نہیں دیا، اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ اسلام میں وہ تخلیقی قوت ہے، اجتہاد کی وہ عظیم صلاحیتیں ہیں اور فکر و عمل کی ایسی استوار بنیادیں ہیں کہ وہ کسی بھی دور میں نئے مسائل کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔

جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ گردشِ لیل و نہار نے ہمیں فکر و نظر کے ایک اہم اور نئے موڑ پہ لا کھڑا کیا ہے تو دوسرا اقدام اس سلسلہ کا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بغیر کسی مرعوبیت اور تاثر کے معروضی طور سے یہ دیکھیں کہ وہ کون سے نئے مسائل اور الجھنیں ہیں جنھیں ہم کو حل کرنا ہے اور وہ کیا نئے مسائل ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے۔

اور اس کے بعد تیسرا قدم اس سمت میں جو اٹھنا چاہیے وہ نظام کار کی تفصیلات کا ہے۔

آئیے اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان مسائل پہ غور کریں۔

جدید مسائل کو ہم دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ مسائل جن کا تعلق عقائد و علم سے ہے اور وہ جو تہذیب و تمدن کی صف میں داخل ہیں۔ اعتقادی اور علمی مسائل میں سرِ فہرست دو مسئلے ہیں۔ اثباتِ باری اور حقیقتِ روح۔ یہ دونوں مسئلے ہمارے لیے اساسی اور بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ ہمارے نزدیک وجودِ باری صرف منطق و فلسفہ کا اشکال نہیں، بلکہ دین کی اساس ہے۔ اخلاق کا محور ہے اور روحانیت کی معراج ہے۔ تعلق باللہ، خشیتِ الٰہی، تقویٰ اور اللہ تعالیٰ سے محبت و عشق کی سرمستیاں ایسی کیفیتیں ہیں جن سے قطع نظر کرکے کوئی صحت مند دینی تصور قائم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کا وجودِ گرامی اس کے فیوض رحمت اور مخلوق سے اس کا ایک خاص طرح کا رشتہ و تعلق ایسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار دین کا انکار ہے اور اس طلب و جستجو کا انکار ہے جس سے سالک کے دل میں شوق و اشتیاق کی آگ بھڑکتی ہے اور سیر الی اللہ پر اکساتی اور آمادہ کرتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عقیدہ و ایمان کی اس صورت پر دو جہتوں سے اعتراض کیا جاتا ہے۔

ا۔ یہ کہ اثباتِ باری سے متعلق آج تک مدرسیت نے جو دلائل پیش کیے تھے وہ منطقی حیثیت سے بہت کمزور ہیں اور ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر بھروسہ کیا جا سکے۔ کانٹ نے ان دلائل کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ وہ جو تعلق [illegible] تسبب کی [illegible] پر مبنی ہیں۔ وہ جن میں غایت و مقصد کو اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار دیا گیا ہے، اور وہ جن کا تعلق خود کامل کے تصور سے ہے۔ ان کو یہ اپنی اصطلاح میں Teleological, Cosmological اور Ontological کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

تعلیل و تسبب کی بنا پر اثباتِ باری کے مسئلہ میں تین اشکال ہیں:

(۱) یہ کہ عالم ہست و بود ابھی مکمل ہی کب ہوا ہے۔ یہ تو کروڑوں برس گذر جانے کے بعد بھی ہنوز معرضِ تکمیل و ارتقا میں ہے۔ یہ اپنی صلاحیتوں اور مضمرات کے اعتبار سے غیر محدود امکانات کا حامل ہے۔ اسے ابھی پروان چڑھنا ہے، بڑھنا ہے اور وجود کے نئے نئے دبستان سجانا ہے۔ لہٰذا اس کو بنے بنائے معلول یا ایسی شئے نہیں قرار دیا جا سکتا جو محدود اور ڈھلی ڈھلائی ہو۔

اس دلیل میں دوسرا نقص یہ ہے کہ یہ آگے نہیں بڑھتی۔ چنانچہ اثباتِ باری کے بعد اس کی محکمی و استواری خود بخود ٹوٹ جاتی ہے اور اگر اسے پروردگار تک پہنچ کر ختم ہونا اور ٹوٹنا ہی ہے تو اس سے پہلے یہ کیوں نہ ٹوٹ جائے۔ اس میں تیسرا بہت بڑا عیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت صرف ایک صناع کی نہیں۔ ایک رب اور ایسی پرورش کرنے والی رحیم و کریم ذات کی ہے جو وجود کے ہر ہر مرحلہ میں اپنی شفقتیں بکھیرتی اور رحمتیں برساتی ہے اور علت و معلول کے رشتہ و تعلق میں دلالت کا یہ عظیم الشان پہلو بالکل مفقود ہے۔

غایت و مقصد کو بھی اثباتِ باری کے لیے مبنیٰ ٹھہرانا سُود مند نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تک اس کارخانہ وجود کا تعلق ہے۔ اس میں ہمیں حرکت، ارتقا، اور ایسے قوانین اور پیمانوں کا تو احساس ہوتا ہے جو کارفرما ہیں۔ مگر غرض و مقصد کا نہیں۔ غرض و مقصد کا تعلق ایک طرح کے استدلال اور تجرید سے ہے۔ اس انداز استدلال میں اصولی قباحت یہ مضمر ہے کہ اس کا تعلق اس قیاس سے ہے کہ جس طرح انسان مادہ کو حسب منشا مختلف صورتیں عطا کرتا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح کوئی ذات گرامی اس ہیولیٰ عالم کو صفات کی بوقلمونیوں سے آراستہ کرتی رہتی ہے ——— حالانکہ یہی مسئلہ تو محل نظر ہے کہ کوئی ذات گرامی اس عالم سے الگ خارج میں پائی جاتی ہے جس نے پہلے اس ہیولیٰ عالم کو پیدا کیا اور پھر اسے وجود کی مختلف سطحوں سے گذارا۔ یہ قیاس منطق کی اصطلاح میں قیاس مع الفارق کہلاتا ہے۔ جس میں مصادرہ علی المطلوب کا مغالطہ بھی پنہاں ہے۔ اس میں اس کے علاوہ یہ عیب بھی پایا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا صانع ہونا تو ثابت ہوتا ہے پروردگار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رب اور رحیم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

تیسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عالم کی ہر ہر شئی چونکہ ناقص ہے اس لیے اس کے مقابلہ میں ایک "کامل" کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر کانٹ کا اعتراض یہ ہے کہ تصور شئی وجود شئی کو مستلزم نہیں۔ یعنی اگر میں ذہن میں تین سو ڈالر کا تصور کرلوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تین سو ڈالر میری جیب میں بھی پائے جاتے ہیں "کامل" کی حیثیت محض ایک تصور کی ہے شئی موجود کی نہیں کیونکہ یہاں کی ہر ہر شئی ناقص ہے۔

زیادہ سے زیادہ اس دلیل کا اقتضا یہ ہے کہ ایسا ہونا چاہیے لیکن "ہونا چاہیئے" اور "ہے" میں فاصلہ کی جو دیواریں حائل ہیں ان کو ہر کوئی جانتا ہے۔

(۲) وجود باری سے متعلق اعتراض کی دوسری نوعیت اس تصور کے تاریخی پس منظر سے متعلق ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ توحید کا عقیدہ مخالفین کے نقطۂ نظر سے ایک طرح کی تجرید کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ تاریخ اور اثریات کی چھان بین سے اس وقت تک جو مواد فراہم ہوا ہے اس سے عناصر پرستی، بُت پرستی اور ایسے مراکز عبادت ہی کا پتہ چل سکا ہے جن میں دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی توحید کا نہیں۔ ہم اس کے بارہ میں چونکہ شروع میں کافی تفصیل سے لکھ چکے ہیں اس لیے یہاں اعادہ کی حاجت نہیں۔

روح سے متعلق بھی افلاطون کے تصورات اور دلائل اب درخور اعتنا نہیں سمجھے جاتے۔ فکر و تجرید کے جدید ترین نہج نے اس سلسلہ میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان بلاشبہ ایک ذی شعور ہستی ہے، جو استدلال و استنتاج کی بے پناہ صلاحیتوں سے بہرہ مند ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان میں بجز دماغ کے کوئی اور شخصیت بھی پائی جاتی ہے جو سوچتی اور غور و تعمق سے کام لیتی ہے، یا جسم انسانی میں جسم کے علاوہ کوئی روح حلول پذیر ہے۔ انسان کے بارہ میں دوئی یا ثنویت کا یہ تصور سائنس اور مادیت کے اس دور میں اپنا اثر و رسوخ کھو رہا ہے۔

وجود روح کا مسئلہ بھی صرف ایک متکلمانہ موشگافی نہیں بلکہ اس کا تعلق ہمارے بنیادی دینی تصورات سے ہے۔ اگر جسم انسان میں روح کا قائم بالذات وجود نہیں تو پھر عذاب قبر اور حشر و نشر کی تشریح و تعبیر کے سلسلہ میں دوسرا موقف اختیار کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اس کا اثر تصور نبوت پر بھی پڑے گا اور ہم مجبور ہوں گے کہ نبوت کو تجربے اس انداز سے پیش کریں کہ اس میں اور انسان کے مادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصوّر میں کوئی تضاد نہ پایا جائے۔

رہی یہ بحث کہ خود اس دماغ کی حقیقت کیا ہے جو سوچتا، سمجھتا اور منصوبے بناتا ہے، اور یہ کہ یہ سوچ اور فکر کے عملیہ میں کس حد تک مجبور و متاثر ہے، اور کس حد تک اپج اور طرفگی پر قادر ہے۔ تو یہ ایک طویل اور الگ بحث ہے۔ جو مختلف مدارس فکر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہم یہاں اس سے تعرض کیے بغیر صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو سادہ لوح حضرات یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ادھر دو صدیوں میں علمی دنیا میں گویا کچھ ہوا ہی نہیں، اور فکر و نظر اور اصول و تصورات میں کوئی ایسی تبدیلی سرے سے رونما ہی نہیں ہوئی ہے جو توجہ طلب اور شائستہ اعتبار ہو، ان کو دیکھنا چاہیے کہ انفس و آفاق میں کیا کیا تغیرات ابھر آئے ہیں اور غور کرنا چاہیئے کہ علوم و فنون کی ترقیات نے انسان کو گمراہی کے کس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے ۔۔۔ ہمارا قدیم علم الکلام صرف اس بحث سے آشنا ہے کہ صفات اللہ تعالیٰ کا عین ہیں یا غیر، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت کن وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن اب صورت حال یہ نہیں، اس وقت بحث کا محور صفات نہیں خود ذات اور وجود ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ محبوب حقیقی اور حضرت حق جو ہمارے ایمانیات کا بہترین اور اہم جز ہے اور جو ہماری ترقی اور پرورش کا تنہا ضامن ہے، موجود بھی ہے یا نہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں روح کا افلاطونی تصور سوا چند معتزلہ کے اہل السنت کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلم تھا۔ اس لیے اس کے بارہ میں ابن سینا، ابن رشد اور ابن قیم کے ہاں بحث کا انداز صرف یہ تھا کہ اس کو بقا میسر ہے یا نہیں۔ مگر اب روح کا یہ مفہوم ہی محل بحث ہے اور اس سلسلہ میں استدلال صرف خیال آرائی یا ذہنی تصریحات پر مبنی نہیں۔ بلکہ اس کا دارومدار نفسیات، علم الاعصاب، تشریح اور مختلف تجربات پر ہے۔

افکارِ غزالی

امام غزالی کے شاہکار "احیاء العلوم" کی تلخیص اور ان کے افکار پر سیر حاصل تبصرہ۔

از مولانا محمد حنیف ندوی۔

طبع دوم۔ صفحات ۵۱۳ : قیمت : ۱۰/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ: سکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

© rasailojaraid.com